© rasailojaraid.com

نظرات

گذشتہ دو شماروں کے نظرات میں ہم نے دارالسلطنت دہلی، اور میرٹھ وغیرہ کے فرقہ وارانہ فسادات کی مثال دے کر اس صورتِ حال کی سنگین نوعیت کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی، جس سے ہندوستانی مسلمانوں کو سامنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے موجودہ زمانے کے فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم کے وقت کے فرقہ وارانہ فسادات سے بھی زیادہ خوفناک اور سنگین ہیں، اور کوئی بھی آدمی دیکھ سکتا ہے کہ اس زمانے میں جبکہ تقسیم ملک کے صدمہ اور احساس شکست سے سیاسی لیڈروں کی حالت دگرگوں نظر آتی تھی، اکثریتی طبقہ کے عوام میں مسلم دشمنی، اور مذہبی منافرت کا جذبہ موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں کہیں درجہ کم اور ہلکا نظر آتا اور اگرچہ مشرقی پنجاب مغربی، یوپی، اور بہار و بنگال میں دونوں قوموں، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان زبردست خونریز تصادم ہوئے تھے، جن کے دوران مرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی لیکن ملک کے باقی حصوں میں اس فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بڑا حصہ موجود تھا، جو ہندو مسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہنماؤں، برگزیدہ اور خدا ترس صوفی ریوں، سنتوں اور سادھوؤں کی ان تھک محنت سے صدیوں میں کہیں جاکر پیدا ہوا تھا۔ کبھی بڑے شہر بمبئی کلکتہ، دہلی، نواکھالی چھپرا وغیرہ میں بڑے پیمانے پر لرزہ خیز کشت وخون ہوا تھا لیکن ہندوستان کے اندر گاندھی اور آزاد جیسے وہ لوگ موجود تھے، جو آزادی اور سوراج سے بھی زیادہ بیش قیمت، ہندو مسلم اتحاد کو سمجھتے تھے، اور ان کے اعلیٰ مقاصد میں سب سے اونچی جگہ پر یہ بات تھی کہ ہندوستان کا مستقبل، دو بڑی قوموں کے اتحاد سے تعمیر ہو سکتا ہے اور ان قوموں کا باہمی مناقشت اور رزم آرائی سے نہ صرف یہ کہ ملک کا امن غارت ہو کر رہ جائے گا بلکہ اس کی سالمیت اور مستقبل کی امید سب کی سب خطرے میں پڑ جائیں گی۔ اور یہی وجہ تھی کہ جس وقت ہندو مسلم فسادات کے سلسلہ میں گاندھی جی نے پانی کو سر سے گذرتے دیکھا تو وہ اپنے ہی چیلوں کی حکومت کے مقابلہ میں ہندو مسلم اتحاد کو ممکن بنانے کے لئے مرن برت رکھ کر بیٹھ گئے، اور اس وقت تک برت کو ختم کرنے پر رضامند نہیں ہوئے جب تک کہ آر ایس ایس سمیت ہندوستان کی ہر تنظیم اور طبقہ کے لوگوں نے انہیں فرقہ دارانہ بھائی چارہ اور قومی امن وسلامتی کو دوبارہ قائم کرنے کا یقین نہیں دلا دیا۔

گاندھی جی نے اپنا برت کھولنے کے لئے جو شرائط ہندوستانی عوام اور ہندوستان کی حکومت کے سامنے رکھی تھیں ان میں مسلمانوں کے مذہبی مراکز اور عبادت عبادت کو غیر مسلموں کے ناجائز قبضوں سے نجات دلانے کی شرط بھی شامل تھی، اسی شرط کے مطابق قطب صاحب سے شرنارتھیوں کا قبضہ ہٹا اور پھول والوں کی سیر کا میلہ ہندو مسلمانوں کے روایتی تعاون اور شرکت کے ساتھ منایا گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گاندھی جی کے کہنے پر ہی راج کماری امرت کور، مس مردولا سارا بھائی اور سبھدرا جوشی نے اغوا شدہ مسلم لڑکیوں اور عورتوں کی بازیابی، انہیں پاکستان میں ان کے رشتہ داروں کے پاس پہنچانے کا کام سنبھالا، اور انھوں نے سبھدرا جوشی اور کانگریس کے گاندھیائی مقلدوں کے ساتھ اس ترکمان گیٹ اور آصف علی روڈ کے مسلمان محلوں میں رات کو پہرے دیے جنھیں ۱۹۷۶ء میں اس حکومت کے بلڈوزروں اور فوج کی گولیوں کا سامنا کرنا پڑا، جس کی قیادت وہی اندرا گاندھی کر رہی تھیں، جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے خوفناک اور شورش انگیز و خونریزی سے بھرپور دنوں میں غیر مسلم فسادیوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے انھوں نے راتوں کو جاگ کر پہرے دیے تھے۔ یہ ایک علامت اور ایک مثال ہے، جس کے آئینہ میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ دل کیسے بدلتے ہیں اور دماغ کس طرح تبدیل ہو جاتے ہیں۔

یہی صورت مسلم قیادت کے ساتھ بھی پیش آئی ہے۔ جس کی پہلی جیسی ہمہ ہمی اور شان و شوکت تو آزادی کے بعد تقسیم کے ہمہ گیر منفی اثرات کی وجہ سے باقی نہ رہی تھی، جس کے نعرہ ہائے مستانہ اور زمزمہ سنجیوں کی بلند آہنگی سے بقول شخصے ع:

"دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان"

کی کیفیت پورے ملک پر آدھی صدی کے قریب چھائی ہوئی دکھائی دیتی رہی تھی تاہم مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد سعید دہلوی ...... ڈاکٹر سید محمود، مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، جیسے لوگ باقی اور زندہ تھے جنھوں نے گاندھی جی، جواہر لال نہرو،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سردار پٹیل، اور کانگریس کے صف اول کے ان لیڈروں کے ساتھ شانہ بشانہ رہ کر جد وجہد آزادی میں حصہ لیا تھا، جو آزادی کے بعد ہندوستان کی قسمت کے مالک بنے تھے، اور جو ایک گاندھی جی کے سوا سب کے سب حکومت میں شامل ہو گئے تھے، اور اگرچہ مسلمانوں کے بارے میں پہلے جیسے کشادہ دل نہ رہے تھے لیکن پرانے ساتھیوں اور آزمودہ کار محب الوطن، مسلم رہنماؤں کے سامنے آنکھوں کی شرم اور چہروں کا لحاظ اس حد تک باقی تھا کہ ان کی کسی بات کو ٹالنا ان کے لئے بڑی حد تک ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

اس زمانے میں اگرچہ مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے وزارت داخلہ کے خفیہ سرکلر کے تحت بند ہو گئے، ان کے اجتماعی تفاخر اور تہذیبی تشخص کو ختم کرنے کے منصوبے بروئے کار لائے گئے، مسلمانوں کے تہذیبی اور ثقافتی مرکزی علاقوں دہلی، یوپی، اور بہار وغیرہ میں اردو زبان کے چلن کو بیک جنبش قلم ختم کر کے، یک طرفہ طور پر ہندی زبان کو سرکاری زبان بنا دیا گیا، اور مسلم اداروں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دارالعلوم دیوبند، اور دوسری تعلیم گاہوں پر سخت نگرانی قائم کی گئی تاہم اس مذکورہ باقی ماندہ قیادت کا پاس و لحاظ اتنا تھا کہ ظاہری دکھ رکھاؤ برقرار رہا، ان ہی لوگوں کے حلقوں سے متعلق لوگوں کو ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے الیکشنوں میں ٹکٹ دیے گئے، اور ان ہی لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو وزارتیں دے کر حکومت میں بھی شریک کیا گیا۔

مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سید محمود، مولانا مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، حافظ محمد ابراہیم، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، اور مولانا احمد سعید وغیرہ پر مشتمل اس مسلم قیادت میں کچھ لوگ وزارتوں کے اندر تھے، کچھ باہر رہے لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان میں سے کوئی ایک بھی حکمراں طبقے میں شامل قومی رہنماؤں، جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، پنڈت گووند بلبھ پنت، بی جی کھیر، مرارجی ڈیسائی، ڈاکٹر بی سی رائے، اور سی بی گپتا وغیرہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو کمتر سمجھنے کو تیار نہ تھا، وہ لوگ جب بھی اپنی شکایتیں پیش کرتے تو ان کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے سے بلند درجہ کے لوگوں سے بات کر رہے ہیں یہی وجہ تھی کہ مسلم مسائل کے سلسلے میں، حکومت کے کارپردازِ ممتاز لیڈروں کے ساتھ تبادلہ خیال کے دوران نرم و گرم نشیب و فراز بھی اکثر آجاتے تھے اور جن کا نتیجہ ہمیشہ ان مسلم رہنماؤں کے حق میں نکلتا تھا، مسلم یونیورسٹی، دارالعلوم دیوبند، اردو زبان کی تحریک، اور دوسرے اقلیتی مسائل ان ہی لوگوں کی مزاحمت اور مقابلہ کے طرزِ عمل کی بدولت زندہ رہے، اور ان لوگوں کی زندگی تک سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا وزن و وقار نہ صرف باقی رہا بلکہ نمایاں طور پر محسوس بھی کیا جاتا رہا۔

لیکن یہ صورت زیادہ دنوں تک اس لئے قائم نہیں رہ سکی کہ ان سب لوگوں کی مدتِ حیات اور مہلتِ زندگی تیزی کے ساتھ ختم ہونے لگی، جو آدھی صدی تک رزم گاہوں، اور بزم ہائے دوستداراں میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے، سب سے پہلے سردار پٹیل رخصت ہوئے، پھر رفیع احمد قدوائی، مولانا آزاد، مولانا مدنی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، پنڈت پنت اور آخر میں جواہر لال نہرو اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو گئے اور یوں ۱۹۶۴ء کے وسط تک وہ پوری بساط سمٹ گئی، جس نے آزادی کی جدوجہد سے لے کر آزادی کے حصول تک کا فاصلہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈال کر طے کیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس قومی قیادت کے دنیا سے اٹھنے کے بعد، اکثریتی اور اقلیتی تعلقات میں فاصلہ بڑھنے لگا۔ حکومت اور سیاست پر نو آمدہ لوگوں، اور نئی مسلم قیادت کے درمیان ذہنی تعلق کا رشتہ ٹوٹنے لگا، حکومتی سربراہ دنیا سے رخصت ہوتے تو اپنی پالیسیاں اور ان کے دوررس اثرات و نتائج اپنے جانشینوں کے لئے بطور ورثہ چھوڑ گئے، مسلم قیادت میں جو لوگ گذشتہ رہنماؤں کے جانشین بنے ان کے پاس اپنے پیش روؤں جیسی نہ تو خود اعتمادی تھی نہ ہی ان جیسا تجربہ اور مسائل کی گہری واقفیت اور نظریاتی ٹھوس بنیاد، اس لئے ابتدا میں تو کچھ ڈانواں ڈول کیفیت اس لئے باقی رہی کہ کانگریس کے اندرونی خلفشار کا سلسلہ جواہر لال نہرو کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوگیا۔ اور وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے مختصر دور حکومت کے بعد، جواہر لال نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی کو خود اپنے اقتدار کے تحفظ اور انتخابی مصلحتوں کی بنا پر مسلمانوں کی اجتماعی حمایت کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے ہندوستان کی سیاست اور حکومت کو زیادہ سے زیادہ سیکولر طریقہ اور ہر مذہبی اکائی کو مطمئن کرنے کے اصول پر قائم کرنے کی جو حکمت عملی وضع کی، اس کے تحت، مسلمانوں کو زیادہ نمائندگی دینے، گذشتہ ناانصافیوں کو ختم کرکے، اقلیتوں کو انصاف دینے، اس پالیسی کے تحت، خود حکومت کی طرف سے انکشاف کیا گیا کہ ”پاکستانیوں اور متوقع پاکستانیوں کو سرکاری ملازمتوں سے الگ رکھا جائے“، کی ہدایت پر مشتمل وہ خفیہ سرکلر واپس لے لیا گیا ہے، جو سردار پٹیل کے حکم پر مرکزی وزارت داخلہ کی طرف سے جاری کیا گیا تھا) اس کے علاوہ دور نشاۃ الثانیہ کا دور، جس کی ابتدا وزیر اعظم اندرا گاندھی کے اس کھلے اعلان سے ہوئی کہ اردو خالص ہندوستان کی زبان ہے اور کسی دوسرے ملک کی زبان ہو نہیں سکتی ــــ اور جس کی پیش رفت کا ایک اہم مرحلہ بہار میں اردو کو دوسری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرکاری زبان قرار دینے کے اعلان کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ سب مسائل خود حکومت کی طرف سے اٹھائے گئے۔ اس لئے اس مسلم قیادت کے پاس کرنے کے لئے فی الحقیقت کوئی کام ہی نہ رہ گیا تھا، جو مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور مولانا مدنی کی جانشینی کے دعوبداری کے ساتھ میدان میں اتری تھی۔ اس نئی قیادت کی بے بضاعتی اور بے عملی دراصل اس وقت ظاہر ہوئی، جب ۱۹۶۷ء کے الیکشن میں اندرا گاندھی کی تبدیل شدہ حکومت اور ۱۹۷۷ء میں قائم ہونے والی جنتا پارٹی کی حکومت کے دور میں پیدا ہونے والے محرکات کے مشترکہ نتائج کا اس قیادت کو سامنا کرنا پڑا۔

© rasailojaraid.com